رائگاں

خورشید رضوی

راتگاں

خورشید رضوی

Portable Document Format: AQEEL ABBAS
www.facebook.com/mazeedkitaben/

ثریّا کے نام

میں ساتھ ترے شورشِ طوفاں کے لئے ہوں
تو ساتھ مرے راحتِ ساحل کے لئے ہے

ترتیب

خورشید رضوی کی شاعری	منیر نیازی	۱۱
مناجات		۱۳
نعت		۱۵
یوں تو وہ شکل کھو گئی گردشِ ماہ و سال میں		۱۷
ابروئے ابر سے کرتا ہے اشارا مجھ کو		۱۹
اِک شاخ سبز اور صبا اور نفس مرا		۲۱
یہ طرح طرح کے جو خوف ہیں انہیں دور کر		۲۳
ایک خیال		۲۵
یہ جو نک تھے یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے		۲۷
نمِ ابر بہار میں چلنا		۲۹
وہ جو لوگ اہلِ کمال تھے وہ کہاں گئے		۳۱
دنیا میں جو اہلِ دل رہے ہیں		۳۲
دل پر جو برگِ گل بھی لگا وار جانگا		۳۴
تجسیم		۳۶
انبارِ گہر میں کانِ زر میں		۳۷
اِک معما ہے مری ذات عجیب		۴۱
گرتے ہوئے بدن کا نگر چھوڑ جاؤں گا		۴۳
آنکھ کے تِل میں رکا ہے کہ تہہ دِل میں ہے تو		۴۴
خاک پر ایک گہری نظر		۴۶

تا چند بحرِ غم میں دلِ زار جائے گا	۴۷
ہر زہ مست جان مری باد یہ پیمائی کو	۴۹
دن گزرتے رہے سانسوں میں تھکن آتی رہی	۵۰
ہے وقت کبھی پتھر یا رو کبھی دریا ہے	۵۲
ایک خواہش	۵۵
سفرِ شام نے رہ رہ کے ڈرایا مجھ کو	۵۷
عہد شباب تیرے ساتھ کتنے حباب اٹھ گئے	۵۹
یہ مری روح میں گونجتا کون ہے؟	۶۱
قفس سے بال و پر طائراں کو دیکھ لیا	۶۲
مری اصلِ ذات کا مرکزہ	۶۴
عکس نے میرے رلایا ہے مجھے	۶۷
کچھ پھول تھے کچھ ابر تھا کچھ بادِ صبا تھی	۶۹
دشت و کہسار میں پھرتا ہوں علم غم کے لئے	۷۱
تیری نگاہِ لطف بھی ناکام ہی نہ ہو	۷۳
نابینائی میں ایک خواب	۷۵
یہ سوچتا ہوں مرے ماہ و سال کا کیا ہو	۷۶
دیکھتے رہئے یہاں کیا نہ رہے کیا رہ جائے	۷۸
سلگتے جنگلوں میں صورتِ موجِ ہوا ہوں	۸۰
بقا کو لرزشِ رنگِ فنا سے پہچانا	۸۲
سات سمندر پار وطن کی یاد	۸۴
یادوں کو بام و در میں نظر آئے آئینہ	۸۶
اچانک رخ بدلتی جا رہی ہے	۸۷
سفرِ خواب کا عمر بھر کس لئے	۸۸
حاصل کو آنسوؤں میں ڈبونا بھی ہے ضرور	۹۰
توازن	۹۲

کل میں اُنہی رستوں سے گزرا تو بہت رویا	۹۳
دل کا جو معیار تھا کیسا عجب معیار تھا	۹۵
اب سے پہلے وہ مری ذات پہ طاری تو نہ تھا	۹۷
کیوں دلِ زار قدم شوق میں دھرتا کیسا	۹۸
یاد اتری صفتِ خامۂ مانی دل پر	۱۰۰
پگڈنڈی	۱۰۲
دلوں میں بارِ یقین و گماں اٹھائے ہوئے	۱۰۳
پلٹ کر اشک سوئے چشم تر آتا نہیں ہے	۱۰۵
ہُوا نہ تیری مہک سے کبھی جدا مرا ہاتھ	۱۰۷
وہ برگ وہ بار کتنے خوش تھے	۱۰۹
تریاق	۱۱۰
چپ رہنا بہتر ہے	۱۱۱
پھر وہ فضا نہیں ملی اُس شبِ مرمریں کے بعد	۱۱۲
دل میں داغ جلے	۱۱۴
حوالے جس قدر تھے اب وہ سارے بدلے بدلے ہیں	۱۱۵
افغانستان کے لئے ایک نظم	۱۱۶
تم کو مری افتاد کا اندازہ نہیں ہے	۱۱۸
ہنر ہے کوئی دمِ نقشِ پا سے کون کہے	۱۱۹
دیکھ واعظ کو کہ آزادِ گنہ خود بھی نہیں	۱۲۱
اترا ہے ترا ہاتھ مرے دل کے سبو پر	۱۲۳
یہ شہرت ہے کہ رسوائی مگر حد سے زیادہ ہے	۱۲۴
گنھریاں	۱۲۵
رباعیات	۱۲۷

خورشید رضوی کی شاعری

پاکستان میں دو طرح کے شاعر ہیں۔ ان کی ایک قسم ہر وقت اور ہر دم صفحۂ ظہور پر رہتی ہے۔ ان کی ہستی اسی سبب سے ہے اور وہ اس سے یکسر غافل نہیں رہتے۔ دوسری طرح کے شاعر زائشِ شعر سے زیادہ تخلیقِ شعر میں مبتلا ہتے ہیں اور خورشید رضوی اسی دوسری قبیل کے شعراء میں سے ہیں۔ کاروبارِ حیات ان کے لئے فقط کاروبار نہیں وہ اس سے ایک نئی حقیقت ایک طرزِ حیاتِ نو کے بارے میں سوچتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے شاعر دور موجود میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

خورشید رضوی کے کلام کے بارے میں اپنے تجزیے کی تصدیق کے لئے ان کی صرف ایک غزل پیش کروں گا کہ کلامِ شاعر ہر طرزِ تنقید سے زیادہ معتبر ہوتا ہے:

یہ جو ننگ تھے یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے مجھے کھا گئے

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے مجھے کھا گئے

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے مجھے کھا گئے

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جُڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے مجھے کھا گئے

یہ عیاں جو آبِ حیات ہے اِسے کیا کروں
کہ نہاں جو زہر کے جام تھے مجھے کھا گئے

وہ نگیں جو خاتمِ زندگی سے پھسل گیا
تو وہی جو میرے غلام تھے مجھے کھا گئے

میں وہ شعلہ تھا جسے دام سے تو ضرر نہ تھا
پہ جو وسوسے تہِ دام تھے مجھے کھا گئے

جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

منیر نیازی

۱۹-اکتوبر ۱۹۹۵ء

لاہور

مناجات

کبریائی کی رِدا عرشِ بریں پر رکھ کر
بے نیازی کی ادا صرفِ کرم کرتے ہوئے
زینہ زینہ کبھی لاہوت کی رفعت سے اتر

وسعتِ عرصۂ کونین سے کتراتے ہوئے
یوں مرے دل کی جراحت میں سمٹ آ جیسے
جیسے —— خوشبو کسی غنچے میں سمٹ آتی ہے

ہے مرے ظرف سے باہر تری عظمت کا تضاد
چھوڑ دے میرے لئے اپنے تنوّع کا جلال
ایک ہی رنگ میں کچھ دیر مرے پاس ٹھہر

بے زبانوں کے لئے دل میں بھرے پیار کا رنگ
سنگ میں محوِ نمو سبزۂ کہسار کا رنگ
دل پہ مرہم کی طرح پرسشِ غم خوار کا رنگ

یوں تو تُو کون سے منظر میں نہیں ہے لیکن
میری درماندہ سی، محدود سی، مجبوب سی آنکھ
بس اِسی ایک دریچے میں تجھے مانگتی ہے

نعت

نازاں ہے اِس پہ دل کہ بلایا گیا مجھے
آخر درِ حضورؐ پہ لایا گیا مجھے

اِس راہ میں زمیں کی طنابیں کھنچی رہیں
ہر گام گردشوں سے بچایا گیا مجھے

نادیدہ ایک لمسِ محبت تھا دستگیر
تھک کر اگر گرا تو اٹھایا گیا مجھے

سورج بھی اقتدا میں چلا اور کشاں کشاں
لے کر حضور میں مرا سایا گیا مجھے

ہر کہکشاں کی گرد مرے بال و پر میں تھی
ایسی بلندیوں پہ اڑایا گیا مجھے

اشکوں کی چلمنوں سے زمانے گزر گئے
جو کچھ سنا ہوا تھا، دکھایا گیا مجھے

خورشیدؔ حاضری یہ نصیبوں کی بات ہے
نازاں ہے پھر بھی دل کہ بلایا گیا مجھے

یوں تو وہ شکل کھو گئی گردشِ ماہ و سال میں
پھول ہے اک کِھلا ہوا حاشیۂ خیال میں

اب بھی وہ روئے دلنشیں، زرد سہی، حسیں تو ہے
جیسے جبینِ آفتاب، مرحلۂ زوال میں

اب بھی وہ میرے ہم سفر ہیں روشِ خیال پر
اب وہ نشہ ہے ہجر میں، تھا جو کبھی وصال میں

اُن کے خرامِ ناز کو بوئے گل و صبا کہا
ہم نے مثال دی مگر رنگ نہ تھا مثال میں

اہلِ ستم کے دل میں ہے کیا مرے کرب کا حساب
اُن کو خبر نہیں کہ میں مست ہوں اپنے حال میں

کیسا پہاڑ ہو گیا وقت گزارنا مجھے
زخم پہ جم گئی نظر خواہشِ اندمال میں

تو نے مرے خمیر میں کتنے تضاد رکھ دیئے
موت مری حیات میں، نقص مرے کمال میں

○

ابروئے ابر سے کرتا ہے اشارہ مجھ کو
جھلک اُس آنکھ کی دکھلا کے ستارہ مجھ کو

ہوں میں وہ شمع سرِطاق جلا کر سرِشام
بھول جاتا ہے مرا انجمن آرا مجھ کو

رائگاں وسعتِ ویراں میں یہ کھلتے ہوئے پھول
اِن کو دیکھوں تو یہ دیتے ہیں سہارا مجھ کو

میری ہستی ہے فقط موجِ ہوا، نقشِ حباب
کوئی دم اور کریں آپ گوارا مجھ کو

دام پھیلاتی رہی سود و زیاں کی یہ بساط
ہاں مگر میرے جنوں نے نہیں ہارا مجھ کو

کچھ شب و روز و مہ و سال گزر کر مجھ پر
وقت نے تا بہ ابد خود پہ گزارا مجھ کو

موجِ بے تاب ہوں میں، میرے عناصر ہیں کچھ اور
چاہئے صحبتِ ساحل سے کنارا مجھ کو

رزق سے میرے مرے دل کو ہے رنجش خورشید
آسمانوں سے زمینوں پہ اتارا مجھ کو

○

اک شاخِ سبز اور صبا اور نفس مرا
کیا رشکِ آشیانہ بنا ہے قفس مرا

شعلہ ہوں اور گرم روی ہے مری سرشت
بہتر یہ ہے کہ ساتھ نہ دیں خار و خس مرا

کُھلتا ہے جا کے کس کی طبیعت پہ دیکھئے
مجھ سے بھی ماورا، سخنِ دُور رس مرا

چاکِ قفس ہے اور گزرتی ہوئی بہار
تھکتی ہے آنکھ میری نہ چلتا ہے بس مرا

پنہاں جو صاعقے ہیں وہ دل سے نکل نہ آئیں
جب ابرِ یادِ یار سے دامن ہو مس مرا

ہاتھوں کی بھی پناہ نہ کی پیشِ تیغِ یار
سر خم کیا کہ شیوہ نہیں پیش و پس مرا

میں نقشِ پا ہوں وسعتِ صحرا میں پائمال
کیا حال پوچھتی ہے صدائے جرس مرا

خورشید یہ ملالِ طبیعت ہے لازوال
کارِ عبث ہے شغلِ نشاط و ہوس مرا

یہ طرح طرح کے جو خوف ہیں اِنہیں دور کر
ترے دل میں کھولتی دلدلوں سے ظہور کر

وہ جو شب چراغ، دل و دماغ میں دفن ہے
کبھی اس کے نور سے گھر کو بقعۂ نور کر

یہ زمانہ کیا ہے ترے سمند کی گرد ہے
نہیں انکسار سے ماننا تو غرور کر

تری سرحدوں پہ عجیب ایک طلسم ہے
کبھی اپنی ذات کے ہفت خواں کو عبور کر

کبھی آئنے سے نکل کے سیلِ جہاں میں آ
کبھی دوسروں کے وجود کا بھی شعور کر

نہیں راحتوں میں وہ لذتیں جو تھکن میں ہیں
دلِ ہرزہ گرد! کچھ اور ابھی مجھے چُور کر

جو نہاں ہیں تجھ میں تجلّیاں نہ ہوں رائگاں
کبھی کنجِ دل کو حرا بنا کبھی طور کر

ایک خیال

مرے دل میں ایک خیال ہے
کہ میں اپنا جسم اتار کر
تری چشمِ خفتہ کو پَیر کر
ترے شہرِ خواب میں جا بسوں

مرے اترے جسم کی پوستیں
کو اٹھا کے اہلِ زمانہ جب
سوئے شہرِ مرگ روانہ ہوں
تو میں تیرے روزنِ چشم سے
اُنہیں دیکھ دیکھ ہنسا کروں
کبھی اُن کے سوگ کے جھوٹ میں
رچی اُن کی آہِ گراں سنوں
کبھی تیری آنکھ کے تِل میں بیٹھ
کے تیرے اشکِ نہاں گنوں

وہ جو تو نے مجھ سے چھپائے تھے
وہ جو جلوتوں میں بجھائے تھے
وہ جو خلوتوں میں جلائے تھے
وہ چراغ ہوں مرے سامنے
ترے طاقِ جاں میں دھرے ہوئے

مرے دل میں ایک خیال ہے
کہ میں اپنی روح اتار کر
اُسے اُن چراغوں کی لو دکھاؤں
جو قید برف کی سل میں ہیں
اُسے اُن شراروں کی زد پہ لاؤں
جو دستِ سنگ میں بند ہیں
——— ترے دل میں ہیں

یہ نقابِ جسم ہٹے تو ہو
یہ حجابِ روح اٹھے تو ہو
تری اصلِ ذات کے سامنے
مری اصلِ ذات کا آئنہ

یہ جو ننگ تھے یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے مجھے کھا گئے

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے مجھے کھا گئے

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے مجھے کھا گئے

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جُڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے مجھے کھا گئے

یہ عیاں جو آبِ حیات ہے اِسے کیا کروں
کہ نہاں جو زہر کے جام تھے مجھے کھا گئے

وہ نگیں جو خاتمِ زندگی سے پھسل گیا
تو وہی جو میرے غلام تھے مجھے کھا گئے

میں وہ شعلہ تھا جسے دام سے تو ضرر نہ تھا
پہ جو وسوسے تہہِ دام تھے مجھے کھا گئے

جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

○

نمِ ابرِ بہار میں چلنا
سایۂ یادِ یار میں چلنا

ہو کے بے نقشِ پا، مثالِ صبا
خلوتِ شاخسار میں چلنا

چڑھتے سورج کے روبرو مجھ کو
چاندنی کے خمار میں چلنا

آسماں پر یہ مہر و ماہ جنہیں
دامِ لیل و نہار میں چلنا

گردشوں سے ملول ہو کر بھی
جبرِ بے اختیار میں چلنا

جسم و جاں نے اِنہی سے سیکھا ہے
اپنے اپنے مدار میں چلنا

دل میں اک موج ہے کہ چاہتی ہے
پھر کسی آبشار میں چلنا

اے لہو تھم بھی جا رگِ جاں میں
کیا دلِ داغ دار میں چلنا

○

وہ جو لوگ اہلِ کمال تھے وہ کہاں گئے
وہ جو آپ اپنی مثال تھے وہ کہاں گئے

مرے دل میں رہ گئی صرف حیرتِ آئنہ
وہ جو نقش تھے، خدوخال تھے وہ کہاں گئے

گری آسماں سے تو خاک خاک میں آ ملی
کبھی خاک میں پرّوبال تھے وہ کہاں گئے

سرِ جاں یہ کیوں فقط ایک شام ٹھہر گئی
شب و روز تھے، مہ و سال تھے وہ کہاں گئے

مرے ذہن کا یہ شجر اداس اداس ہے
وہ جو طائرانِ خیال تھے وہ کہاں گئے

○

دنیا میں جو اہلِ دل رہے ہیں
آزردہ وہ مستقل رہے ہیں

کچھ دل میں بھی صبر کی کمی تھی
کچھ زخم بھی جاں گسِل رہے ہیں

ہنگامِ فراقِ جسم و جاں ہے
بچھڑے ہوئے لوگ مل رہے ہیں

جو دامنِ ہوش میں پڑے تھے
خوابوں میں وہ چاک سل رہے ہیں

پھر دورِ شباب یاد آیا
ڈھلوان پہ پھول کھل رہے ہیں

وہ قلّۂ کوہسار کے پیڑ
آزاد، ہوا میں ہل رہے ہیں

اک ہم ہیں کہ موسمِ جنوں میں
یخ بستہ و پابہ گل رہے ہیں

یہ روز و شب اور یہ مہ و سال
خوابوں میں مرے مخل رہے ہیں

کیوں آج بجھے بجھے ہو خورشید
یہ رنج تو متصل رہے ہیں

○

دل پر جو برگِ گُل بھی لگا وار جا لگا
تیرا سخن بھی کل صفتِ خار جا لگا

کہنے کو ہم ہر ایک ستم سے گزر گئے
گزرے کہاں ہیں، روح میں انبار جا لگا

اب عزم کیا ہے اے مرے واماندہ ہم سفر
سایہ تو اب فصیل کے اُس پار جا لگا

رک رک گیا زبان پہ آ کر جوابِ تلخ
یونہی کشاں کشاں مجھے آزار جا لگا

پھیلی کہاں کہاں شجرِ زندگی کی شاخ
آخر کو پھل جو تھا وہ سرِ دار جا لگا

شاید تجھے خبر ہو کچھ اے گردشِ سپہر
کس آسماں پہ طالعِ بیدار جا لگا

دن کو بچھی زمیں پہ چنبیلی کی چاندنی
شب کو فلک پہ خیمۂ زر تار جا لگا

وہ میری شاخِ دل میں کھلا تھا جو ایک پھول
ڈھلتے دنوں میں وہ بھی مجھے بار جا لگا

افسوس تو یہ ہے کہ جو موتی سا تھا سخن
وہ بھی دلوں پہ صورتِ زنگار جا لگا

خورشید جس کی گرمیٔ محفل تھی بات بات
اب وہ بھی نقش ہو، سرِ دیوار جا لگا

تجسیم

سبز پیڑوں کے لہکنے کی طراوت لاؤ
سرخ پھولوں کے مہکنے کی حلاوت لاؤ
دشت کے، وادی و کہسار کے پھول
خون میں کھلتے ہوئے ساعتِ دیدار کے پھول

صاعقہ کوئی فلک سے لاؤ
جس کی مہمیز سے ہر سمت بپھر کر چھا جائے
کف اڑاتے ہوئے نمکین سمندر کی ایال

گھول کر سارے عناصر کا جلال اور جمال
پیکرِ حرف میں لانا ہے مجھے
درد کا جسم بنانا ہے مجھے

○

انبارِ گہر میں کانِ زر میں
کچھ بھی نہ جچا مری نظر میں

افسوس مرا چراغِ منزل
مستور ہے گردِ رہ گزر میں

وہ کون ہے جس کی روشنی سے
بینائی ہے خاکِ بے بصر میں

تاروں کو شمار کر رہا ہوں
کیا کیا ہوا عمرِ مختصر میں

اُس جلوۂ بام کے علاوہ
آیا نہیں فرق بام و در میں

ہر سو سیلاب آ گیا ہے
یا غرق نظر ہے چشمِ تر میں

میں خود سے ابھی نہیں ہوں مایوس
امکانِ بہار ہے شجر میں

کیا عطر کھنچا ہے آب و گِل کا
ہر شاخ میں، پھول میں، ثمر میں

اِتنی بھی نہیں ہے خوب وحشت
آ جائے نہ چل کے دشت گھر میں

ثابت قدمی سے گامزن رہ
کیا رکھّا ہے جادۂ دگر میں

پھر سے وہ ہوا چلی کہ دوڑا
ذوقِ پر و بال، بال و پر میں

تھم جا پل بھر سمندِ ایام
اک لمحہ ملا ہے عمر بھر میں

وہ راہ میں اک شجر تھا سرسبز
اور ہم تھے روانیٔ سفر میں

چاہو تو اِسی کو عیش سمجھو
گزرے گی اِسی گزر بسر میں

تجھ سا موتی نہ مجھ سا کنکر
ڈھونڈے سے ملے گا بحر و بر میں

اُس آنکھ کی نغمگی کے آگے
سُرمہ ہے گلوئے نغمہ گر میں

وہ بھول گئے پلک جھپکنا
جو ڈوب گئے تری نظر میں

کیا شے ہے شراب اِس کے آگے
اک خواب چڑھا ہوا ہے سر میں

کل میں نے بہت اداس دیکھا
خورشید کو مطلعِ سحر میں

○

اک معمّا ہے مری ذات عجیب
بند ہیں مجھ میں تضادات عجیب

کون سی سمت سے توڑوں خود کو
ہے کہیں مجھ میں کوئی بات عجیب

تیرنے والے کبھی ڈوب کے دیکھ
زیرِ دریا ہیں طلسمات عجیب

سرِ مژگاں کوئی چھینٹا نہ پڑا
پسِ مژگاں ہوئی برسات عجیب

ہم تو سمجھے تھے کہ جیتے بازی
نکل آئی ہے مگر مات عجیب

جانے کیا منظرِ کہسار میں ہے
دل میں آتے ہیں خیالات عجیب

ٹوٹتا کب ہے طلسمِ شب و روز
دن سے نکلے تو ہوئی رات عجیب

یہ خد و خال نہیں تھے اپنے
پیش آئے ہمیں حالات عجیب

ہارنے بھی نہیں دیتی خورشید
روشنی ہے پسِ ظلمات عجیب

○

گرتے ہوئے بدن کا نگر چھوڑ جاؤں گا
گھبرا کے دستکوں سے یہ گھر چھوڑ جاؤں گا

میں عینِ زندگی ہوں ٹھہرنا نہیں مجھے
سب منظروں کو مثلِ نظر چھوڑ جاؤں گا

خود خاک ہو کے گردِ سفر میں رہوں گا اور
اِن بستیوں میں ذوقِ سفر چھوڑ جاؤں گا

ہو گا نہ سوگوار مرے واسطے کوئی
جلتا ہوا دیا ہوں سحر چھوڑ جاؤں گا

ہستی مری عدم ہی سہی صورتِ سحاب
میں سیپیوں میں آبِ گہر چھوڑ جاؤں گا

○

آنکھ کے تِل میں رکا ہے کہ تہہِ دل میں ہے تو
اے مرے اشکِ تپاں کون سی منزل میں ہے تو

آزماتے ہیں سفینوں کو ٹھکانے تیرے
کبھی گرداب میں پنہاں کبھی ساحل میں ہے تو

نارسائی میں رسائی کی تڑپ رکھتا ہوں
کہ سمندر میں ہوں میں اور مہِ کامل میں ہے تو

اے جنوں ہو کے رہا بھی تری وحشت نہ گئی
میر، سمجھتا تھا فقط شورِ سلاسل میں ہے تو

پیشِ آئینہ تری موجِ نگہ دیکھتا ہوں
کبھی خود میں ہے کبھی اپنے مماثل میں ہے تو

اس رہِ شوق کا انجام کہیں ہے ہی نہیں
اے دلِ زار ابھی جس کے اوائل میں ہے تو

خاک پر ایک گہری نظر

خاک آئینہ بھی ہے خاک خدوخال بھی ہے
خاک خود چاک بھی ہے کوزۂ سیّال بھی ہے
چہرۂ خاک پہن لیتا ہے چہرے کتنے

پتھروں میں یہ تپش کھائی ہوئی خاک کے رنگ
اور اِسی خاک سے اِن سبز درختوں کی نمود
اور رگِ تاک کے اندر سفرِ قطرۂ مے
اور اِسی خاک سے یہ دیدۂ بیدار مرا

کتنے گل، کتنے گلوں سے بھی حسیں تر منظر
خاک سے پھوٹتے ہیں خاک میں ڈھل جاتے ہیں
خاک ہے خاک فقط نام بدل جاتے ہیں

○

تاچند بحرِ غم میں دلِ زار جائے گا
آخر جہاں تھمے گا وہیں ہار جائے گا

بہتا ہوا سفینۂ عمرِ دوروزہ میں
خوابیدہ جائے گا کوئی بیدار جائے گا

برسے گی آسماں سے کسی دن دوائے مرگ
روئے زمیں سے زیست کا آزار جائے گا

معصوم طائروں کے لئے دل گرفتہ ہوں
اِن کو بھی آدمی کا عمل مار جائے گا

آخر کو ہنس پڑیں گے کسی ایک بات پر
رونا تمام عمر کا بےکار جائے گا

وہ تیرے روبرو مرا آئینے کا سکوت
تاعمر ذہن سے نہ وہ اسرار جائے گا

اِس بزم سے سبک نہ اٹھے گا کبھی کوئی
ہر شخص آرزو سے گرانبار جائے گا

○

ہرزہ مت جان مری بادیہ پیمائی کو
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اک لالۂ صحرائی کو

اُس کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر مت دیکھ
شعلہ ایسا ہے کہ لے جائے گا بینائی کو

اُن کی قسمت میں ہے سر پھوڑتے پھرنا کہ جنہیں
سنگِ در مل نہ سکا ناصیہ فرسائی کو

ایک آواز سے ڈرتے ہیں ہم اِتنا کہ مدام
شورِ محشر میں دبا رکھتے ہیں تنہائی کو

اپنا گھر اپنا ہی گھر ہے جب اِسے کھولو گے
درد و غم آن کھڑے ہوں گے پذیرائی کو

دن گزرتے رہے سانسوں میں تھکن آتی رہی
دل میں اڑ اڑ کے وہی گردِ محن آتی رہی

تھک گئے عرصۂ احساس میں چلتے چلتے
راہ میں حسرتِ کوتاہیٔ فن آتی رہی

بس دریچے سے لگے بیٹھے رہے اہلِ سفر
سبزہ چلتا رہا اور یادِ وطن آتی رہی

گلشنِ دہر میں کچھ بوئے وفا باقی ہے
کہ خزاں میں بھی صبا سوئے چمن آتی رہی

پھول آنکھوں سے گزر کر تہہِ دل میں بھی کھِلا
رُت بھی بدلی تو وہی بوئے سمن آتی رہی

اہلِ دنیا زر و گوہر کی تمنا میں رہے
اوس پڑتی رہی سورج کی کرن آتی رہی

ہم کبھی چاک گریباں تھے کبھی خاک بسر
کر گزرتے رہے جو عشق میں بن آتی رہی

○

ہے وقت کبھی پتھر، یارو کبھی دریا ہے
کاٹے نہیں کٹتا ہے، روکے نہیں رکتا ہے

پلکوں پہ نمی سی ہے، لفظوں میں کمی سی ہے
پیہم جسے سہتا ہوں، کم کم اُسے کہنا ہے

اب چشمِ کرم کیسی، اب دل کو بھٹکنے دو
کیوں شام کو گھر آئے جو صبح کا بھولا ہے

ہاں آنکھ پہ ارزاں ہو، اے گریۂ تنہائی
اب میں ہوں سرِ صحرا یا صبح کا تارا ہے

یہ کرب یہ بیتابی گلشن کی فضاؤں میں
اے نکہتِ گل کیوں ہے، اے موجِ صبا کیا ہے

پھولوں کے مہکنے سے، سبزے کے لہکنے سے
کیا ربط ہے باطن کو، کیوں خون مچلتا ہے

بجھتی ہوئی آنکھوں میں جلتی ہوئی خوش فہمی
باطل ہی سہی پھر بھی کہہ دیجئے کہ ایسا ہے

جو نقش ہوا دل پر، اُس جنبشِ ابرو سے
وہ چاند مرے دل میں گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے

تجھ میں بھی بہت کچھ ہے اے عالمِ یکسانی
موتی کبھی شبنم ہے، سیپی کبھی غنچہ ہے

ہے خواب اگر اچھا اتنا بھی غنیمت جان
تعبیر یہاں کیسی، یہ خواب کی دنیا ہے

پھر شاخِ سماعت میں نم دوڑ گیا خورشید
یہ اُس کی ہنسی ہے یا بہتا ہوا چشمہ ہے

ایک خواہش

ایسا کوئی آستاں
جس پہ کوئی مل سکے
ایسا کوئی گلستاں
دل کی کلی کِھل سکے
غار کے منہ پر پڑا
سنگِ گراں ہل سکے

ایسا کوئی آئنہ
جس میں طلسمات ہو
عکس ہی میرا نہ ہو
بلکہ مری ذات ہو
خود پہ نظر ہی نہیں
خود سے ملاقات ہو

ایسی سحر جس میں کاش
پھر وہ فضا آ سکے
گریۂ نمناک کی
آب و ہوا آ سکے
دل کا دریچہ کھلے
دل کی صدا آ سکے

○

سفرِ شام نے رہ رہ کے ڈرایا مجھ کو
جی اُٹھے سنگ و شجر دیکھ کے تنہا مجھ کو

بڑھ کے احباب سے آنکھیں تو کھلی رکھتا ہوں
جانے کیوں خواب نظر آتی ہے دنیا مجھ کو

چودھویں شب کے طلسمات بھی ہوتے ہیں عجیب
سایۂ شاخ لگا، شاخ سے اچھا مجھ کو

میں اندھیروں میں کبھی دل کے سہارے نہ گرا
روشنی پا کے دیا آنکھ نے دھوکا مجھ کو

بہہ گئی عمرِ رواں آبِ رواں کی صورت
اور مرے عکس سے تکتا رہا دریا مجھ کو

خاک کے پار کا منظر بھی جھلکتا ہے مگر
بار دیتا ہی نہیں خاک کا پردا مجھ کو

زور کرتی ہے جو نسبت ہو کسی سے خورشید
شہر میں جا کے بلا لائے گا صحرا مجھ کو

○

عہدِ شباب تیرے ساتھ کتنے حجاب اٹھ گئے
سر سے جنوں نکل گیا آنکھ سے خواب اٹھ گئے

اور بھی ہونٹ جل اٹھے ریت کو ریت مان کر
اور بھی تشنگی بڑھی جب سے سراب اٹھ گئے

جن سے نگہ میں نور تھا دیکھتے دیکھتے وہ لوگ
کرب و بلائے زیست سے صورتِ آب اٹھ گئے

لوحِ خیال پر تری شکل بنی نہ رات بھر
یعنی کتاب عمر سے کام کے باب اٹھ گئے

اب یہی خام کار ہیں جامِ شراب اِنہی کو دے
وہ تری بزمِ ناز کے رندِ خراب اٹھ گئے

رشتۂ آب توڑ کر، نقشِ سراب چھوڑ کر
اُمّتِ غافلاں سے ہم مثلِ کتاب اٹھ گئے

ہم کو اُس انجمن سے ہے ایک گریزِ ناتمام
ہو کے حباب رہ گئے، بن کے سحاب اٹھ گئے

○

یہ مری روح میں گونجتا کون ہے
بند گنبد میں مثلِ صدا کون ہے

کون سبزے کی صورت میں پامال ہے
سرو بن کر چمن میں کھڑا کون ہے

کس سے چھپ چھپ کے ملنے کو جاتی ہے تو
جنگلوں میں، بتا اے صبا، کون ہے

پھول کھلنے کی کوشش سے اکتا گئے
آنکھ بھر کر انہیں دیکھتا کون ہے

بے دلی سے کہاں ہاتھ آتے ہیں ہم
دل لگا کر ہمیں ڈھونڈتا کون ہے

○

قفس سے بال و پرِ طائراں کو دیکھ لیا
پھر اپنے ولولۂ رائگاں کو دیکھ لیا

وہ میرے پاس سے گزرے تو آج پھر میں نے
نگاہِ دشت سے ابرِ رواں کو دیکھ لیا

تھما جو عشق کا سیلِ رواں تو دونوں نے
وجودِ سنگِ رہِ درمیاں کو دیکھ لیا

لبوں پہ مُہرِ خموشی سہی مگر دل نے
کسی کی آنکھ میں اشکِ نہاں کو دیکھ لیا

نظر نظر ہو پر اتنی بھی بے پناہ نہ ہو
بہار آئی تو ہم نے خزاں کو دیکھ لیا

یہاں پلٹ کے نہ اپنی بھی بازگشت آئی
خلوص و مہر کے کوہِ گراں کو دیکھ لیا

مری اصلِ ذات کا مرکزہ

تہِ دل میں زیرِ زمیں کہیں
مری اصلِ ذات کا مرکزہ
کبھی خود بھی مجھ پہ کھُلا نہیں
کہ وہ سرِّجاں، وہ گرہ ہے کیا

کہ جو کہنہ تر ہے ستاروں سے
کہ جو تازہ تر ہے بہاروں سے
وہ جو فلسفوں سے دقیق تر
ہے، سمندروں سے عمیق تر

کئی آئنوں سے بنا ہوا
وہ ہزار رنگ کا آئنہ
جسے اِک شرر بھی ہے پھلجھڑی
جو ازل سے تابہ ابد جلے
لئے اپنی تابِ شرر فشاں
کے جلو میں کتنے ہی قافلے

جو سرائے وسعتِ ہست سے
——— کئی سالِ نوٗر کی بات ہے
کہ مثالِ نوٗر گزر گئے———
کبھی باز دیدہ ہوئے نہیں

جو فرازِ گنبدِ نیست کے
کسی چاہِ روزنِ تیرہ میں
ہیں اسیر مثلِ صدا پڑے
ابھی آفریدہ ہوئے نہیں

یہ ہزار قرن کے قافلے
یہ ہزار رنگ کے سلسلے
یہ حقیر صورتِ گرد ہیں
مری اصلِ جاں کے طواف میں

مری اصلِ ذات کا مرکزہ
وہ جو گرم و سردِ چشیدہ ہے
جو ہر ایک پست و بلندِ دہر
میں بار بار دویدہ ہے
کبھی شہدِ لب کی حلاوتیں

کبھی زہر خند کی تلخیاں
یہ تمام سرکہ و انگبیں
اُسے گھولتے تو رہے مگر
وہ گہر کسی میں گھُلا نہیں

وہ گہر تلاطمِ بحر میں
وہ مجھی میں مجھ سے بہت بڑا
مری اصلِ ذات کا مرکزہ
کبھی مجھ پہ خود بھی کھُلا نہیں

○

عکس نے میرے رلایا ہے مجھے
کوئی اپنا نظر آیا ہے مجھے

پیشِ آئینہ بہت سوچتا ہوں
کس لئے اُس نے بنایا ہے مجھے

کس لئے وسعتِ صحرا دے کر
تنگ گلیوں میں پھرایا ہے مجھے

کس لئے میرے ہی صحنِ جاں میں
مثلِ دیوار اٹھایا ہے مجھے

میں کہیں اور کا رہنے والا
غم کہاں کھینچ کے لایا ہے مجھے

جس میں اُس چھاؤں کی یاد آ جائے
اب تو وہ دھوپ بھی سایا ہے مجھے

نگہِ ناز سے کیونکر پوچھوں
کیوں نگاہوں سے گرایا ہے مجھے

ہاتھ میں لے کے گریباں میرا
دل نے دل بھر کے ستایا ہے مجھے

سخت حیراں ہوں سرِ کوہ ندا
کون تھا، کس نے بلایا ہے مجھے

○

کچھ پھول تھے، کچھ ابر تھا، کچھ بادِ صبا تھی
کچھ وقت تھا، کچھ وقت سے باہر کی فضا تھی

کچھ رنگ تھے، کچھ دھوپ تھی، کچھ دہشتِ انجام
کچھ سانس تھے، کچھ سانس میں خوشبوئے فنا تھی

کچھ رنگِ شفق تیز تھا، کچھ آنکھ میں خوں تھا
کچھ ذہن پہ چھائی ترے ہاتھوں کی حنا تھی

کچھ گزری ہوئی عمر کی یادوں کا فسوں تھا
کچھ آتے ہوئے وقت کے قدموں کی صدا تھی

صدیوں سے دھڑکتی ہوئی اک چاپ تھی دل میں
ایک ایک گھڑی صورتِ نقشِ کفِ پا تھی

دونوں کو وہی ایک بکھر جانے کا ڈر تھا
میں تھا، گُلِ صد چاک تھا اور تیز ہوا تھی

خورشید سرِ شام تہِ دامنِ کہسار
دل تھا کہ وہی کوہ کی دیرینہ ندا تھی

○

دشت و کہسار میں پھرتا ہوں عَلَم غم کے لئے
کوئی تسکین مری خاطرِ برہم کے لئے

آنکھ اٹھاؤں تو ہر اک چیز ہو پانی پانی
ایک جنبش ہے بہت دیدۂ پرنم کے لئے

اے مژہ ضبط سے لے کام بچا کر رکھ لے
یہ جدائی کا ثمر، وصل کے موسم کے لئے

دل دُکھا ہے تو کوئی دوست مقابل نہ رہا
کون آئینہ بنے درد کے عالم کے لئے

رات ڈھل جانے کو ہے دل کا دریچہ کھولو
اب مناسب ہے ہوا گریۂ پیہم کے لئے

سوگوار اب کے کچھ ایسی ہے گلستاں کی فضا
صف بہ صف پھول بھی کھلتے ہیں تو ماتم کے لئے

جادۂ زیست پہ خوشیاں بھی کھڑی تھیں لیکن
یہ مرا دل کہ اٹھا اور قدم غم کے لئے

○

تیری نگاہِ لطف بھی ناکام ہی نہ ہو
دل تو وہ زخم ہے جسے آرام ہی نہ ہو

چونکا ہوں نیم شب بھی یہی سوچ سوچ کر
وہ آفتاب اب بھی لبِ بام ہی نہ ہو

تم جس کو جانتے ہو فقط اپنی طبعِ خاص
وہ رنج، وہ فسردہ دلی، عام ہی نہ ہو

آہستہ اِس لرزتے ہوئے پُل پہ رکھ قدم
صدیوں کا انہدام ترے نام ہی نہ ہو

اے دل مفر تو کارِ جہاں سے نہیں مگر
اِتنا تو کر کہ اس میں سبک گام ہی نہ ہو

دستک سی دے رہی ہے دریچے پہ بادِ صبح
اے محوِ خواب سن کوئی پیغام ہی نہ ہو

خورشید تو نے کیسے نبھائیں یہ عُزلتیں
جیسے تجھے کسی سے کوئی کام ہی نہ ہو

نابینائی میں ایک خواب

میں ہوں سرچشمۂ اوّل سے بہت دور
پئے نور بھٹکنے والا
روشنی عکس بہ عکس آتی ہے اِن آنکھوں تک
آئنے اپنی خیانت سے نہیں خود واقف
اِن کو معلوم نہیں
زاویے اِن کے بدل دیتے ہیں کرنوں کا مزاج
آج اِس نورِ مُحرّف سے ہے آنکھوں میں تھکن
دل میں خنّاس کی سرگوشیٔ پیہم کی چبھن
کاش سرچشمۂ اوّل سے اُتر آئے کوئی راست کرن
جو مری روح کی ظلمت میں اجالا کر دے
میں کہ ہوں کور، مجھے دیکھنے والا کر دے

○

یہ سوچتا ہوں مرے ماہ و سال کا کیا ہو
ہجومِ نقص میں خوئے کمال کا کیا ہو

ہر ایک صبح اداس اور ہر ایک شام اداس
یہ جس کا حال ہو، اس خستہ حال کا کیا ہو

حقیقتوں کو تو ہموار کر لیا میں نے
خیال دشمنِ جاں ہے خیال کا کیا ہو

مناسبت ہی مرے دل کو زخم سے ٹھہری
مگر عبث ہوسِ اندمال کا کیا ہو

کُھلا نہ کچھ نَفَسِ واپسیں کی حیرت میں
شکست و فتح و عروج و زوال کا کیا ہو

جہاں جواب نہیں صرف بازگشت آئے
وہاں جنونِ صدا و سوال کا کیا ہو

لکھوں میں خود کو سراپا فسردگی خورشید
مگر شگفتگیٔ خال خال کا کیا ہو

○

دیکھتے رہیے یہاں کیا نہ رہے کیا رہ جائے
پائے رہرو نہ رہے نقشِ کفِ پا رہ جائے

دل خود اک داغ ہے سینے میں تو پروا کیسی
داغ رہتا ہے اگر دل میں تو اچھا رہ جائے

یہ بھی ممکن ہے کہ تھم جائے سفینہ دل کا
اور دریا نگہِ یار کا بہتا رہ جائے

عالمِ خواب کا عقدہ نہیں کھلتا یعنی
آنکھ باقی نہ رہے اور تماشا رہ جائے

پاک رہنا ہے جو دنیا سے تو پھر دنیا سے
دامن اِتنا نہ بچا حسرتِ دنیا رہ جائے

کوئی آوازِ جرس بھی ہو بھٹکنے کے لئے
ورنہ ممکن ہی نہیں وسعتِ صحرا رہ جائے

یہیں تھم جائے تو کیا خوب ہو منظر خورشید
لہر میں سبزہ و گُل، موج میں دریا رہ جائے

○

سلگتے جنگلوں میں صورتِ موجِ ہوا ہوں
خود اپنی جنبشِ دامن سے جلتا جا رہا ہوں

فرشتے پر سمیٹے ساحلِ خوں پر کھڑے ہیں
فقط میں غرقِ خوں دریائے خوں میں تیرتا ہوں

محبت، شاعری، مستی، فقیری، بے نیازی
یہ سب مجھ میں کبھی تھے اب میں اِن کا نقشِ پا ہوں

جدھر جاؤں فضاؤں میں غبارِ سیم و زر ہے
مرا دم گھٹ رہا ہے سانس روکے چل رہا ہوں

سُرنگیں وقت کی تاریک ہوتی جا رہی ہیں
ردائے سنگ میں جویائے پیوندِ ضیا ہوں

دھواں کچے گھروں سے پرفشاں ہے کیا سماں ہے
سوادِ شام میں گم سم کھڑا ہوں سوچتا ہوں

کسی کے سایۂ دیوار کا طالب ہوں خورشید
مسلسل چلتے چلتے، جلتے جلتے تھک گیا ہوں

○

بقا کو لرزشِ رنگِ فنا سے پہچانا
خدا کو کشمکشِ ناخدا سے پہچانا

مری نظر نے مجھے میرے آئنے سے نہیں
فقط مرے خدوخالِ انا سے پہچانا

میں آسمان سے اُترا تھا بے لباس مگر
زمیں نے مجھ کو لباسِ وفا سے پہچانا

زمیں پر ترے کوچے کو جذبۂ دل نے
دیارِ خُلد کی آب و ہوا سے پہچانا

زمانے بھر سے الگ اپنی ذات کو میں نے
زمانے کی روشِ ناسزا سے پہچانا

ہزار آنکھ سے اوجھل سہی مگر اُس نے
پسِ حجاب مجھے مدّعا سے پہچانا

سفر میں ہم ترے اپنے کیے پہ بھی نہ گئے
تری جہت کو ترے نقشِ پا سے پہچانا

سات سمندر پار وطن کی یاد

اے میرے وطن
اے پیارے وطن
جب اسکولوں کے گیٹ کھلیں
جب بچوں کا ریلا آئے
پتھر کی سڑک پر پھول کھلیں
خوشبوؤں کا دریا آئے
جب ایک سی وردی پہنے ہوئے
بچوں کو گھر والے بھولیں
جب سائیکلوں اور تانگوں پر
بستے لٹکیں، تھرمس جھولیں
تب سات سمندر طے کر کے
اُن کی چاپیں مجھ کو چھو لیں
اور دل میں درد کی ہوک اٹھے

اے میرے وطن
اے پیارے وطن
جب رنگ بھرا ہو شاموں میں
جب بُور لدا ہو آموں میں
پھرتی ہو مہک مشاموں میں
جب آگ گلُوں کی دہکتی ہو
جب ڈال سِرس کی لہکتی ہو
نافے کی طرح مہکتی ہو
تب دل کے کنج پہ سایہ کناں
چھتری لہرائے بکائن کی
اور اُس میں چھپ کر بیٹھی ہوئی
یادوں کی کوئل کُوک اٹھے

○

یادوں کو بام و در میں نظر آئے آئنے
لو آج پتھروں میں ابھر آئے آئنے

دنیا ہجومِ عکس تھی ملتا کسی سے کون
بس جیسے آئنوں سے گزر آئے آئنے

دل زعمِ فتح میں ہے گرا کر فصیلِ سنگ
اور اب کے راستے میں اگر آئے آئنے؟

بھاگے حقیقتوں سے تو خوابوں میں گھر گئے
موندی جو آنکھ، آنکھ میں بھر آئے آئنے

کس وہم کی تلاش میں سر پھوڑتا پھرا
نکلا نہ کچھ بھی اور مرے سر آئے آئنے

○

اچانک رخ بدلتی جا رہی ہے
زمیں محور سے ٹلتی جا رہی ہے

ستارے سرخ ہوتے جا رہے ہیں
ہر اک تقدیر جلتی جا رہی ہے

نہ جانے یہ حیاتِ ہرزہ پیما
کہاں گرتی سنبھلتی جا رہی ہے

پرندے آشیانوں کو رواں ہیں
مسلسل شام ڈھلتی جا رہی ہے

مرے بعد اب مری خاکِ لحد میں
مری زنجیر گلتی جا رہی ہے

○

سفر خواب کا عمر بھر کس لئے
ستاروں سے ربطِ نظر کس لئے

نہیں آسماں میں اگر کوئی در
تو پھر خاکداں سے مفر کس لئے

یہ آئینہ ساں آمنے سامنے
بنائے گئے بحروبر کس لئے

زمیں آپ غرقاب ہونے کو ہے
سمندر سے نکلے گہر کس لئے

بہاروں میں کیا اب کے آسیب تھا
لگا مجھ کو پھولوں سے ڈر کس لئے

یہ کیوں آج میں نے تبسم کیا
یہ دیوارِ گریہ میں در کس لئے

نہیں میرے لب پر مرے دل کی بات
ہوا اُس کے دل پر اثر کس لئے

ہمیں ڈھانپ لے اے شبِ سرمدی
یہ پیوندِ نورِ سحر کس لئے

یہ مانا کہ خورشید تیری غزل
بڑی دل نشیں ہے، مگر کس لئے

○

حاصل کو آنسوؤں میں ڈبونا بھی ہے ضرور
اِس کِشتِ نامراد میں بونا بھی ہے ضرور

ہر چند اِس کو پھر سے بکھرنا ضرور ہے
بکھرا ہوا یہ ہار پرونا بھی ہے ضرور

کس جبرِ ہست و بود میں الجھی ہے زندگی
ہونا بھی ہے ضرور، نہ ہونا بھی ہے ضرور

پانے کی دُھن بھی عینِ سرشتِ حیات ہے
پائے ہوئے کو ہاتھ سے کھونا بھی ہے ضرور

ہنسنا بھی ایک جبر ہے اِس سے مفر کہاں
ہنسنے کے بعد بیٹھ کے رونا بھی ہے ضرور

یہ جانتے ہوئے بھی کہ تعبیر کچھ نہیں
اِس سرزمینِ خواب میں سونا بھی ہے ضرور

جنگ آزما ہے اپنے مقدّر سے آدمی
دُھلتا نہیں یہ داغ، پہ دھونا بھی ہے ضرور

توازن

مگر نرم رنگین شاخوں پہ یہ جُھولتی نرم رنگین چڑیاں
کڑی سرحدوں کے کڑے پاسبانوں کو
چھوکر گزرتی ہواؤں کے آزاد جھونکے
کھُلی کھیتیوں میں کھلے آسماں کے تلے کچھ کھلے سانس لینے کی مہلت
بڑوں کی لڑائی کے باوصف آپس میں شیروشکر رہنے والے یہ بچے
لڑکپن کے ساتھی سے —— (جو کچھ نہیں بن سکا) —— مل کے دل کا دھڑکنا
کوئی دکھ بھری داستاں پڑھ کے آنکھوں میں آجانے والے یہ آنسو
یہ حسّاس پھولوں کا حسّاس شاخوں پہ انجام سے بے خبر ہو کے کھلنا
یہ کچھ دوستوں کا 'صباح و مسا' احمقانہ مگر بے غرض 'ملنا جلنا
خداوندِ عالم کے قدموں میں اپنے تھکے ہارے ماتھے کو رکھ کر
سبک بار ہونے کا احساس ہونا

یہ سب کہہ رہے ہیں۔
ابھی زندگی کو نہ تج'
زندگی اپنے زہروں کا تریاق بھی ہے

○

کل میں اُنہی رستوں سے گزرا تو بہت رویا
سوچی ہوئی باتوں کو سوچا تو بہت رویا

دل میرا ہر اک شے کو آئینہ سمجھتا ہے
ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھا تو بہت رویا

جو شخص نہ رویا تھا تپتی ہوئی راہوں میں
دیوار کے سائے میں بیٹھا تو بہت رویا

آساں تو نہیں اپنی ہستی سے گزر جانا
اترا جو سمندر میں دریا تو بہت رویا

جس موج سے ابھرا تھا اس موج پہ کیا گزری
صحرا میں وہ بادل کا ٹکڑا تو بہت رویا

ہم تیری طبیعت کو خورشید، نہیں سمجھے
پتھر نظر آتا تھا، رویا تو بہت رویا

○

دل کا جو معیار تھا کیسا عجب معیار تھا
عقل آتی تھی مگر اِس کو جنوں درکار تھا

بال و پر آمادہ تھے تسخیرِ دنیا کے لئے
دل مگر اِس کُلفتِ بے سود سے بیزار تھا

ہم کو آیا ہی نہیں بزمِ جہاں کا اعتبار
اِس کے ہر اقرار میں پنہاں کوئی انکار تھا

رات کا پچھلا پہر اور دہشتِ دشتِ فلک
سوچ میں ڈوبا ہوا ہر ثابت و سیّار تھا

کل کڑکتی دھوپ میں چلتے ہوئے تیرا خیال
یا ردائے ابر تھی یا سایۂ اشجار تھا

اک نگاہِ واپسیں پر تھم گئی تھی زندگی
نبض ناہموار تھی سورج سرِ کوہسار تھا

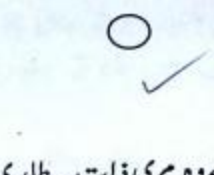

اب سے پہلے وہ مری ذات پہ طاری تو نہ تھا
دل میں رہتا تھا مگر خون میں جاری تو نہ تھا

نبض چلتی ہے تو قدموں کی صدا آتی ہے
اس قدر زخمِ جدائی کبھی کاری تو نہ تھا

وہ تو بادل کا برسنا ہے عناصر کا اصول
ورنہ اشکوں کا نمک آنکھ پہ بھاری تو نہ تھا

دل میں کھلتے ہیں تری یاد کے اعجاز سے پھول
اِس میں کچھ شائبۂ بادِ بہاری تو نہ تھا

یہ بھی اندر کا کوئی روگ ہے ورنہ ہم کو
عمر بھر حوصلۂ نالہ و زاری تو نہ تھا

○

کیوں دلِ زار قدم شوق میں دھرنا کیسا
خاک ہو ہو کے خلاؤں میں بکھرنا کیسا

تیرے تھمنے سے یہ طوفاں تو نہ تھم جائے گا
بادباں تو بھی اٹھا وقت سے ڈرنا کیسا

ایسی پسپائی سے غرقابیٔ جاں اچھی ہے
دل کے چڑھتے ہوئے دریا کا اترنا کیسا

ریزہ ریزہ مری ہستی کو بہا کر لے جا
اے مرے عشق بلا خیز ٹھہرنا کیسا

شاخِ گُل مُہر بلب سوچ رہی ہو جیسے
ہے اگر خاک میں ملنا تو سنورنا کیسا

آنکھ اگر ڈوب کے روئی ہے تو تھمنے کی نہیں
زخم اگر زخمِ تمنا ہے تو بھرنا کیسا

مت جلا پاؤں بھی اِس تشنہ لبی میں خورشید
وادیٔ سنگِ سیہ بخت میں جھرنا کیسا

○

یاد اتری صفتِ خامۂ مانی دل پر
بن گئی پھر وہی تصویرِ پرانی دل پر

دل ورق تھا ترے پیمانِ محبت کا امیں
پھر گیا سیلِ شب و روز کا پانی دل پر

آئنے کی یہ گواہی ہے کہ وہ دن نہ رہے
سایہ افگن ہے مگر خوابِ جوانی دل پر

اب تو اک عمر سے ہر لحظہ گراں ہے جیسے
دشتِ غربت میں کرے شام گرانی دل پر

اپنے دامن میں لئے ڈوبتے سورج کی مہک
مہرباں ہو کے جھکی رات کی رانی دل پر

تم نے رسماً جسے تحریرِ ہوا سمجھا تھا
لکھ لیا ہم نے وہ پیغامِ زبانی دل پر

بہہ گیا ایک ہی لمحے میں جو منظر خورشید
آج تک ہے اُسی منظر کی روانی دل پر

پگڈنڈی

سبز گوں کھیتوں میں مٹیالی سی پگڈنڈی کا حسن
یہ سحر کے جھٹ پٹے میں ایک نورانی لکیر

اے زمیں کی مانگ! کس افشاں سے بھردوں میں تجھے
اشک برساؤں کہ چن دوں پھول تا حدِ نظر
تو افق تک بھی اگر جائے تو کب دھندلائے گی
ساتھ دینے کو مری حدِ نظر بڑھ جائے گی

○

دلوں میں بارِ یقین و گماں اٹھائے ہوئے
رواں ہے، رختِ سفر کارواں اٹھائے ہوئے

کوئی تو ہے پسِ دیوارِ گلستاں جس کے
نظارہ جو ہیں شجر، ایڑیاں اٹھائے ہوئے

مری مثال پرانے شجر کی ہے، دل پر
ہزار داغ بہار و خزاں اٹھائے ہوئے

فسونِ صحبتِ شب میں تو نیند ٹلتی رہی
پھروں گا دن کو یہ بارِ گراں اٹھائے ہوئے

ترے خیال کو پھرتا ہوں یوں لئے جیسے
زمین سر پہ پھرے آسماں اٹھائے ہوئے

نہ جانے جسم کے ساحل پہ اب سفینۂ جاں
کس انتظار میں ہے بادباں اٹھائے ہوئے

○

پلٹ کر اشک سوئے چشمِ تر آتا نہیں ہے
یہ وہ بھٹکا مسافر ہے جو گھر آتا نہیں ہے

قفس اب آشیاں ہے خاک پر لکھی ہے روزی
کبھی دل میں خیالِ بال و پر آتا نہیں ہے

پہاڑوں کی سیاہی سے فزوں دل کی سیاہی
وہ حُسن اب اپنی آنکھوں کو نظر آتا نہیں ہے

شجر برسوں سے نقشِ رائگاں بن کر کھڑے ہیں
کوئی موسم ہو، شاخوں میں ثمر آتا نہیں ہے

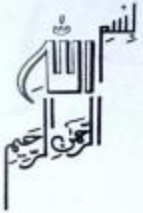

رائگاں

مرے اِس اوّلیں اشکِ محبت پر نظر کر
یہ موتی سیپ میں پھر عمر بھر آتا نہیں ہے

کوئی قاتل رواں ہے میری شریانوں میں خورشید
جو مجھ کو قتل کرتا ہے نظر آتا نہیں ہے

○

ہوا نہ تیری مہک سے کبھی جدا مرا ہاتھ
چمن چمن ترا دامن صبا صبا مرا ہاتھ

میانِ تیرہ شبی اب بھی یاد آتا ہے
کسی کی ساعدِ سیمیں کو ڈھونڈتا مرا ہاتھ

یہ فیض بھی تو اِنہی ظلمتوں سے پایا ہے
کبھی کبھی مہِ کامل کو جا لگا مرا ہاتھ

مرے لہو سے نہیں، اِس کی بازگشت سے ڈر
خروشِ حشر، ترا دامنِ قبا، مرا ہاتھ

زمیں کے تھامنے والے کرم ہے یہ بھی ترا
دعا کو ہاتھ اٹھایا تو اٹھ گیا مرا ہاتھ

نہیں کہ دل میں مرے مدعا نہیں کوئی
مگر دراز نہیں بہرِ مدعا مرا ہاتھ

جو میرے دل میں ہے خورشید مجھ کو لکھنا ہے
بلا سے آئے تہِ خنجرِ جفا مرا ہاتھ

○

وہ برگ وہ بار کتنے خوش تھے
مرغانِ بہار کتنے خوش تھے

اب آنکھ کھلی تو سوچتا ہوں
خوابوں کے دیار کتنے خوش تھے

ساحل پر جس طرح سفینہ
سرکش سرِ دار کتنے خوش تھے

اب گریہ کُناں یہ ابر پارے
کہسار کے پار کتنے خوش تھے

جب تجھ میں گزر نہ تھا خوشی کا
ہم اے دلِ زار کتنے خوش تھے

تریاق

گاؤں کے اجڑے ہوئے مدفن میں پونم کا طلسم
آج کی تہذیب کے ہر زہر کا تریاق ہے

شہر والوں کے تبسّم کی ریاکاری سے دور
محفلوں کی کھوکھلی سنجیدہ گفتاری سے دور
الجھے الجھے سے دلائل کی گرانباری سے دور

محفلیں لوحِ تکلّف کی وہی پٹتی لکیر
اپنی اپنی چار دیواری کے زنداں میں اسیر
کیا کرے وہ جس کے دل میں وسعتِ آفاق ہے

آسحر تک اس دبستانِ حقیقت میں پڑھیں
موت کے بوڑھے معلّم سے کتابِ زندگی

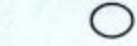

چپ رہنا بہتر ہے
یا کہنا بہتر ہے

یا اِسی دوراہے پر
دُکھ سہنا بہتر ہے

اور بہتے لمحوں میں
گھُل بہنا بہتر ہے

کہیں بایاں اچھا ہے
کہیں دہنا بہتر ہے

اب پورے انساں کا
کٹ رہنا بہتر ہے

○

پھر وہ فضا نہیں ملی اُس شبِ مرمریں کے بعد
وہ تری بات کی مہک نکہتِ یاسمیں کے بعد

وہ چمن اور وہ جوئے آب، سلسلۂ خیال و خواب
اور وہ دھواں سا ماہتاب تیرے رخ و جبیں کے بعد

کیا کہوں کیا طلسم تھا شاخ و صبا کے درمیاں
جیسے بدن میں کپکپی بوسۂ اوّلیں کے بعد

موت قبول ہے مگر تلخیٔ لب نہیں قبول
زہر بھی شوق سے پلا، ہاں مگر انگبیں کے بعد

زیرِ نگیں ہوں جب تلک نام کو پوجتے ہیں لوگ
نام کو مانئے، اگر نام رہے نگیں کے بعد

جذبِ زمیں کو چھوڑ کر اُڑ تو چلا ہے آدمی
دیکھئے اب کہاں جمیں اس کے قدم زمیں کے بعد

نورِ یقیں کہیں کہیں، چشمکِ برق کی طرح
وہم و گماں یقیں سے قبل، وہم و گماں یقیں کے بعد

○

دل میں داغ جلے
سرخ چراغ جلے

اتنے پھول کھلے
جیسے باغ جلے

شمع بجھے ساقی
اور ایاغ جلے

دور اندھیرے میں
ایک سراغ جلے

جوں جوں روشن ہو
اور دماغ جلے

○

حوالے جس قدر تھے اب وہ سارے بدلے بدلے ہیں
ہر اک دیکھی ہوئی شے کے اشارے بدلے بدلے ہیں

کسی سے بھی ملیں ٹوٹا ہوا دل لے کے آتے ہیں
کہ جو شعلہ بھی ہے اس کے شرارے بدلے بدلے ہیں

یہ ہم کس سرزمیں میں آ گئے اے قافلے والو !
فلک پہلے سے اونچا ہے ستارے بدلے بدلے ہیں

کلی دل کی کہاں کھلتی ہے باہر کی بہاروں سے
کہ اب اندر سے سب منظر ہمارے بدلے بدلے ہیں

اِدھر ہے یا اُدھر ہے کوئی چلمن اجنبیّت کی
نظر بدلی ہوئی ہے یا نظارے بدلے بدلے ہیں

افغانستان کے لئے ایک نظم

لو چھٹے[1] سال کی چلمن بھی گری تیرہ و تار
حیرتِ گُنگ مری بول اٹھی آخرِ کار

اپنی آنکھوں سے جو دیکھوں تو نظر آتی ہے
ایک نا راست ترازو سرِ میدانِ وغا
لوگ کہتے ہیں کہ ہے عدل کی میزان بپا

اِس ترازو کا وہ عالم ہے بقولِ شاعر
"جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے"

---

[1] افغانستان پر روسی یلغار کا چھٹا سال

اب کہاں بابر و محمود کی سطوت لیکن
خاکِ فرغانہ و غزنیں سے سوار اٹھتے ہیں
بن کے مہتاب میانِ شبِ تار اٹھتے ہیں
خاک ہو جائیں مگر ہو کے غبار اٹھتے ہیں

○

تم کو مری افتاد کا اندازہ نہیں ہے
تنہائی صلہ ہے مرا خمیازہ نہیں ہے

تم مجھ سے نہ مل پاؤ گے ہرگز کہ مرے گرد
دیوار ہی دیوار ہے دروازہ نہیں ہے

مدّھم ہے نوا میری کسی اور سبب سے
یہ بات نہیں ہے کہ غمِ تازہ نہیں ہے

ہیں شرق سے تا غرب پریشاں مرے ذرّات
جُز موجِ صبا اب کوئی شیرازہ نہیں ہے

جو تیرے لئے ہم پہ کسا جا نہ چکا ہو
اس شہر میں ایسا کوئی آوازہ نہیں ہے

○

بنا رہے کوئی دم، نقشِ پا سے کون کہے
ابھی نہ خاک اڑائے، ہوا سے کون کہے

بچے نشاط نفس دو نفس بچا کے رکھے
یہ مدّعا دل بے مدّعا سے کون کہے

گئی تو بُو ہی نہیں رنگ بھی گلوں سے گیا
پلٹ کے باغ میں آئے صبا سے کون کہے

وہ ملتفت ہیں مگر اب ہمیں دماغ نہیں
کہے ہوئے کو پھر اب ابتدا سے کون کہے

بہت سے روگ دعا مانگنے سے جاتے ہیں
یہ بات خوگرِ رسمِ دوا سے کون کہے

وہ دل کا درد، وہ ناگفتنی سخن خورشید
خدا سے کہہ لیا خلقِ خدا سے کون کہے

○

دیکھ واعظ کو کہ آزادِ گنہ خود بھی نہیں
جس طرح لفظِ ثقاہت کہ ثقہ خود بھی نہیں

آتشِ غیظ بھڑکتی رہی شریانوں میں
اپنے شب خون سے محفوظ سپہ خود بھی نہیں

دم بدم ہم ہی نہ تھے اُس کو منانے والے
ٹھیرتی اُس دلِ نازک میں گرہ خود بھی نہیں

ہے یہ بیداریٔ شب وضع نبھانے کے لئے
ورنہ اب چشمِ طلب، چشمِ برہ خود بھی نہیں

جانے شاہوں سے یہ کیا مانگتے پھرتے ہیں فقیر
جب فقیری سے تھی حسرت شہِ خود بھی نہیں

شکوہ آئینے سے رکھتی ہیں وہ آنکھیں کہ جنہیں
چشمِ نرگس کی طرح ذوقِ نگہ خود بھی نہیں

جل رہا ہے کسی سائے کی طلب میں خورشید
اپنی حدّت سے ملی اُس کو پنہ خود بھی نہیں

○

اترا ہے ترا ہاتھ مرے دل کے سبو پر
یوں جیسے دھنک پھیل گئی بام کے اوپر

میں تیرے لئے ٹوٹ گیا ذات سے اپنی
تو سے خطِ تنسیخ نہ کھینچا من و تو پر

لوٹی تو ہے کچھ طاقتِ پرواز ہماری
کچھ بادِ بہاری نے کئے تو ہیں رفو پر

میں تیری محبت میں وہ پامال ہوا ہوں
ملتا ہے ترا نقشِ قدم ہر بُنِ مو پر

اِس شدّتِ احساس کا کیا کیجئے خورشید
لہریں سی بناتی ہے صبا میرے لہو پر

○

یہ شہرت ہے کہ رسوائی مگر حد سے زیادہ ہے
میں خود اتنا نہیں، سایہ مرے قد سے زیادہ ہے

مرے دل کی گرہ باتیں بنانے سے نہیں کھلتی
کہ مجھ میں بستگی کچھ قفلِ ابجد سے زیادہ ہے

کسی کے پاس حرفِ دل نشیں باقی نہیں ورنہ
قبول اب بھی دلوں کی خاک میں رد سے زیادہ ہے

سویدا کو مرے نسبت بہت ہے سنگِ اسود سے
مگر نقشِ کفِ پائے محمدؐ سے، زیادہ ہے

یہ جانِ ناتواں میری یہ شوقِ بے اماں میرا
توانائی کفِ سیلاب میں سد سے زیادہ ہے

گٹھریاں

صبح کی پہلی کرن رکھتی ہے میرے دوش پر
میلی اُجلی، چھوٹی چھوٹی، موٹی موٹی گٹھریاں
کچھ پرانی کچھ نئی
گٹھریاں جن میں بندھے ہیں لاکھ ناکردہ خیال
کارِ دنیا کے وبال

یہ ہزاروں رنگ کی آپس میں اُلجھی کترنیں
یہ قبائے زندگی کی دھجیاں
منتشر کابوس میرے ناتواں دل پر محیط

دل کہ جس میں بند ہے وہ بقچۂ سربند کتنے سال سے
اَن سلے جس میں ہزاروں پیرہن خوابوں کے ہیں
اطلس و کمخواب و دیبا و حریر

جن کے سینے کی مجھ فرصت نہیں

صبح کی پہلی کرن سے تا شعاعِ واپسینِ شام
میرے پاؤں کی زنجیریں ہیں
کتنیں ہی کتنیں اور دھجیاں ہی دھجیاں
سلسلہ جن کا سمٹتا ہی نہیں
لاکھ نپٹاؤں نپٹتا ہی نہیں
میرے سر پر گٹھریوں کا بد نما ہرام
گھٹتا ہی نہیں

ایسا لگتا ہے کہ میں اک سنگِ مقناطیس ہوں
چار سو اُڑتے ہوئے لوہے کے کانٹوں میں اسیر
خالقِ خواب ! آمدِ تعبیر کی کوئی نوید
بقچۂ سرہند کی کوئی کلید

رباعیات

کھو کر اسے پا جاؤ تو حاصل کہہ لو
منجدھار سے لوٹ آؤ تو ساحل کہہ لو
ہے اپنا سفر اپنے ہی دل سے دل تک
چل پھر کے یہاں آؤ تو منزل کہہ لو

موجوں سے ہراساں نہ کنارے کی تلاش
آنکھوں کو ہے بس آنکھ کے تارے کی تلاش
کچھ عذر ہمیں جان کے دینے میں نہیں
جینا ہے فقط جان سے پیارے کی تلاش

شبنم پہ بھی چل دیدۂ گریاں میں بھی جھانک
اوروں سے بھی مل اپنے گریباں میں بھی جھانک
دو دھارے ہیں اک موج کے جلوت خلوت
آئینہ بھی دیکھ آئنۂ جاں میں بھی جھانک

تھے دید سے غافل ہمیں، ہوں گے تو ضرور
گو آنکھ سے دیکھے نہیں، ہوں گے تو ضرور
سینہ کہ سمندر سے نہیں کم اپنا
سینے میں بھی موتی کہیں، ہوں گے تو ضرور